

مغربی نظام تعلیم میں اسلاموفوبیا کی بنیادیں: تجزیہ و تحقیق

The Foundations of Islamophobia in the Western Education System: An Analysis and Study**Syeda Shumaila Rubab Rizvi***PhD Scholar, Department of Quran and Sunnah,
University of Karachi**Email: shumaila.rubab@salu.edu.pk***Dr. Zeenat Haroon***Chairperson, Department of Quran and Sunnah,
University of Karachi***Abstract**

The Western education system plays a fundamental role in shaping the intellectual heritage, value frameworks, and social identities of societies. However, when ideological biases, cultural assumptions, and one-sided historiography infiltrate these institutions, they cease to be mere centers of knowledge and transform into instruments of intellectual control, identity oppression, and cultural alienation. The presence of Islamophobia within Western academic institutions manifests as a subtle yet highly organized intellectual resistance, deeply embedded in curricula, teaching methods, language, and institutional policies. This form of Islamophobia has become so pervasive that denying its existence would be tantamount to a failure in intellectual integrity.

In subjects like World History or Religious Studies taught in American universities, Islam is often confined to the context of "the Middle Ages," "empire," "caliphate," or "jihad," while aspects such as intellectual tradition, philosophy, fine arts, scientific heritage, and humanitarian contributions are virtually absent. Consequently, students tend to view Islam as a conservative, militant, and inflexible system. Furthermore, the attitudes of academic staff, institutional policies, and the treatment of Muslim students, particularly female students with hijabs, contribute to a broader environment of exclusion and bias. This study critically analyzes the ways in which academic practices and institutional structures perpetuate Islamophobic stereotypes and their impact on Muslim students' self-perception, social alienation, and academic progression. It also examines how Islamic rituals, religious celebrations, and institutional policies intersect to create a double-bind for Muslim students, particularly women, in higher education.

Keywords: Islamophobia, Western Education System, Curriculum Bias, Muslim Identity, Institutional Policies, Cultural Alienation, Academic Stereotypes

تعارف:

مغربی نظام تعلیم دنیا بھر میں علمی ترقی اور فکری آزادی کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ تعلیمی ادارے نہ صرف علم کی ترسیل کا ذریعہ ہیں بلکہ مختلف تہذیبوں، معاشرتی شناختوں اور اقدار کے درمیان مکالمہ قائم کرنے کا بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تاہم، جب تعلیمی اداروں میں نظریاتی تعصبات، ثقافتی مفروضے اور تاریخ نویسی کی ایک طرفہ نمائندگی شامل ہو جاتی ہے، تو یہ ادارے اپنے حقیقی مقصد سے ہٹ کر ایک ایسا بیانیہ تشکیل دینے لگتے ہیں جو مخصوص ثقافتوں اور نظریات کے خلاف تعصبات کو فروغ دیتا ہے۔ مغربی تعلیمی اداروں میں اسلاموفوبیا ایک سنگین مسئلہ بن چکا ہے جو نصاب، تدریس، زبان، اور ادارہ جاتی پالیسیوں میں سرایت کر چکا ہے۔

اسلاموفوبیا کا یہ اثرات اکثر ان تعلیمی مضامین میں دیکھے جاتے ہیں جو عالمی تاریخ، مذہبی تعلیمات یا ثقافتوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں تدریس کی جانے والی تاریخ و مذہبیات کی کتب میں اسلام کو اکثر اوقات "قرون وسطیٰ"، "سلطنت"، "خلافت" یا "جہاد" کے محدود دائرہ میں پیش کیا جاتا ہے، جس سے طلبہ میں اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں اور تعصبات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں، اسلام کو ایک قدامت پسند، جنگجو اور غیر یکدہ مذہب کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، جس کا کوئی فکری یا ثقافتی پہلو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

مزید برآں، تعلیمی عملے کا رویہ اور ادارہ جاتی پالیسیوں میں موجود تعصبات مسلم طلبہ کی خودی، سماجی تعلقات اور تعلیمی کارکردگی پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ خاص طور پر مسلم طالبات، جو حجاب یا دیگر مذہبی علامتوں کے ساتھ تعلیمی اداروں میں شامل ہوتی ہیں، انہیں دوہرا تعصب اور چیلنجز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس تحقیق کا مقصد مغربی تعلیمی اداروں میں اسلاموفوبیا کے اس باقاعدہ اور منظم نفوذ کو سمجھنا اور اس کے اثرات کا تجزیہ کرنا ہے تاکہ اس کے خلاف مؤثر حکمت عملیوں کی تلاش کی جاسکے۔

نصابی تعصبات اور تدریسی رجحانات میں اسلاموفوبیا کی ساخت

تعلیمی ادارے کسی بھی تہذیب کے فکری ورثے، اقداری سانچے اور سماجی شناخت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکن جب انہی اداروں میں نظریاتی تعصبات، مخصوص تہذیبی مفروضے، اور تاریخ نویسی کی

ایک رخیّت داخل ہو جائے، تو یہ ادارے صرف علم کے مراکز نہیں رہتے بلکہ فکری کنٹرول، شناختی جبر، اور تہذیبی اجنبیت کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ مغربی دنیا کے تعلیمی اداروں میں اسلاموفوبیا کی موجودگی ایک خاموش لیکن انتہائی منظم فکری مزاحمت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، جو نصاب، تدریس، زبان، اور ادارہ جاتی پالیسیوں میں اس طرح سرایت کر چکی ہے کہ اس کا انکار کرنا علمی دیانت سے انحراف کے مترادف ہے۔ امریکی یونیورسٹیوں میں تدریس کیے جانے والے World History یا Religious Studies جیسے مضامین میں اسلام کا تصور اکثر صرف "قرون وسطیٰ"، "سلطنت"، "خلافت"، "جہاد" کے تناظر میں محدود کر دیا جاتا ہے، جبکہ فکری روایت، فلسفہ، فنون لطیفہ، سائنسی ورثہ، اور انسان دوستی جیسے پہلو تقریباً غائب ہوتے ہیں۔ نتیجتاً طلبہ اسلام کو ایک قدامت پرست، جنگجو، اور غیر لچکدار نظام کے طور پر دیکھنے لگتے ہیں۔

Ali A. Mazrui نے اس حقیقت کو اپنی تحریر میں یوں بیان کیا:

"The Western educational canon has systematically marginalized Islamic intellectual heritage, reinforcing orientalist stereotypes rather than promoting inclusive global understanding¹".

"مغربی تعلیمی روایت نے اسلامی فکری ورثے کو منظم طور پر نظر انداز کیا ہے، جس سے شمولیت پر مبنی

عالمی فہم کے بجائے استثنائی دقیقانہ تصورات کو تقویت ملتی ہے۔"

لہذا معلوم ہوتا ہے کہ جب اسلامی علمی ورثے کو مسلسل خاموش کر دیا جائے، تو طلبہ کے ذہن میں اسلام ایک جزوی، متعصب اور منفی تصور کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ خاموش تعصب، جو کسی کھلے بیانیے کے بغیر، تدریس اور نصاب کے ذریعے منتقل ہوتا ہے، زیادہ خطرناک ہے کیونکہ یہ "علم" کے لبادے میں تعصب کے بیج بوتا ہے۔ برطانیہ کے اسکولوں میں Prevent Strategy جیسے اقدامات نے تعلیمی ماحول کو مزید سخت اور مشتبہ بنا دیا ہے۔ مسلم طلبہ کو محض اسلامی موضوعات میں دلچسپی لینے، عربی زبان سیکھنے، یا فلسطین سے ہمدردی ظاہر کرنے پر مشکوک سمجھا جاتا ہے۔ اس پالیسی کے تحت اساتذہ کو "ریڈ فلیگ" تربیت دی گئی ہے، جس کی بنیاد پر وہ ایسے طلبہ کی اطلاع سیکورٹی اداروں کو دے سکتے ہیں۔

(Equality and Human Rights Commission (UK) کی رپورٹ کے مطابق:

"The Prevent duty has led to an environment of surveillance in schools, where Muslim students report feeling targeted, marginalized, and under suspicion without cause²".

"پریوینٹ ڈیوٹی نے اسکولوں میں ایک نگرانی پر مبنی ماحول پیدا کیا ہے، جہاں مسلم طلبہ بغیر کسی جواز کے نشانہ بننے، حاشیہ پر ڈالے جانے اور شک کی فضا میں سانس لینے کی شکایت کرتے ہیں۔"

یہ صورتحال نہ صرف تعلیمی ارتقاء میں رکاوٹ ہے بلکہ طالبعلم کی فکری نمو، اعتماد، اور تنقیدی بصیرت کو بھی مفلوج کر دیتی ہے۔ جب ایک طالبعلم یہ سمجھے کہ اس کی دینی وابستگی ہی اس کی تعلیمی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بن سکتی ہے تو وہ یا تو اپنی شناخت سے کٹ جاتا ہے یا ایک نفسیاتی جنگ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر عدنان رشید اپنی کتاب اسلامی تعلیم اور مغربی نصاب: ایک تقابلی مطالعہ میں لکھتے ہیں:

"مغربی نصابی ڈھانچہ نہ صرف اسلامی افکار کو محدود کرتا ہے بلکہ طالبعلم کے ذہن میں اسلامی تاریخ کو ایک مسئلہ اور مغرب کو ایک معیار کے طور پر بٹھاتا ہے۔"³

مذکورہ بالا گفتگو سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلاموفوبیا اب صرف کلاس روم کے باہر کا مظہر نہیں بلکہ وہ تعلیمی اداروں کے اندر بھی ایک ساختی حیثیت اختیار کر چکا ہے جہاں طالبعلم کی سوچ، خودی، اور علمی رجحان کو اس کی مذہبی وابستگی کے تناظر میں مشکوک یا محدود کر دیا جاتا ہے۔

تعلیمی عملے کا رویہ، مسلم شناخت اور تدریسی ماحول میں اسلاموفوبیا

کسی بھی تعلیمی ادارے کا قلب و روح اس کے اساتذہ اور ان کے تدریسی رویے ہوتے ہیں۔ یہ رویے محض تعلیمی تدریس تک محدود نہیں رہتے بلکہ کلاس روم کے کلچر، طلبہ کی خودی، فکری آزادی، اور مذہبی شعور کی تشکیل پر بھی براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ جب کسی استاد کے لاشعور میں مذہب سے متعلق کوئی تعصب موجود ہو، تو وہ درس و تدریس کے دوران اس تعصب کو الفاظ، اشاروں، سوالات یا خاموشی کے ذریعے منتقل کرتا ہے۔ اسلاموفوبیا کی پیچیدہ نوعیت کا ایک بنیادی مظہر یہی غیر محسوس مگر مسلسل ذہنی دباؤ ہے، جو مسلم طلبہ کو ان کے اساتذہ کے رویے میں مختلف انداز میں محسوس ہوتا ہے۔ ایک برطانوی تحقیق، جسے UCL Institute of Education کے Dr. Tariq Modood اور Dr. Nasar Meer نے مشترکہ طور پر ترتیب دیا، میں یہ بات سامنے آئی کہ:

"Many Muslim students reported that teachers avoided Islamic topics, or presented them through security-related frames, thereby reinforcing feelings of marginalization⁴".

ترجمہ: "کئی مسلمان طلبہ نے بتایا کہ اساتذہ اسلامی موضوعات سے اجتناب کرتے ہیں، یا اگر ان پر بات کرتے بھی ہیں تو سیکیورٹی کے سیاق میں، جس سے ان کے حاشیہ پر ہونے کا احساس مزید گہرا ہوتا ہے۔"

لہذا معلوم ہوتا ہے کہ علم کی روشنی دینے والے ادارے بھی جب کسی مذہب کو صرف خطرے یا عدم انضمام کے عدسے سے دیکھتے ہیں، تو طالب علم کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ اُس کی مذہبی شناخت ایک رکاوٹ ہے — نہ کہ ایک معزز تہذیبی سرمایہ۔ کینیڈا میں کی جانے والی تحقیق جسے Ontario Institute for Studies in Education (OISE) نے 2020 میں شائع کیا، اس میں لکھا گیا:

"Islamophobic attitudes among teachers may not be overt, but manifest subtly through lower expectations, exclusion from discussions, and microaggressions⁵".

"اساتذہ میں اسلاموفوبک رجحانات ظاہر طور پر نہیں بلکہ باریک سطح پر نظر آتے ہیں، جیسے کم توقعات رکھنا، مباحثے سے خارج رکھنا، اور ہلکے طنزیہ رویے اختیار کرنا۔"

یہ تحقیق اس بات کو اجاگر کرتی ہے کہ اساتذہ کے لاشعوری رویے کس طرح مسلم طلبہ میں کم اعتمادی، فکری کنارہ کشی اور جذباتی اجنبیت پیدا کرتے ہیں۔ جب استاد کسی طالب علم کو صرف اس لیے مشکوک یا کم صلاحیت والا سمجھے کہ وہ مسلمان ہے، تو تعلیمی مساوات کا دعویٰ محض ظاہری شعار بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر عفت نعیم اپنی کتاب "اسلامی شناخت اور جدید تعلیم" میں اس رویے کی جڑوں کا تعین کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"جب مسلم شناخت کو علمی میدان میں علمی معیار کی بجائے ثقافتی تعصب سے پرکھا جائے، تو طالب علم علم سے نہیں، تعصب سے لڑنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔"⁶

مندرجہ بالا تجزیے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ استاد کا ایک جملہ، ایک نظر، یا کسی موضوع سے اجتناب — یہ سب طالب علم کی ذہنی کیفیت اور تعلیمی اعتماد پر دیرپا اثرات چھوڑتے ہیں۔ کئی طلبہ ایسے ہیں جو اس رویے کی وجہ سے کلاس میں اظہارِ رائے سے گریز کرتے ہیں، اپنے مذہبی پس منظر کو چھپاتے ہیں، یا اپنے عقائد کو ترک کر کے "قابل قبول شناخت" اپنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اسی تناظر میں، فرانس کی ایک رپورٹ، جو Observatoire de la Laïcité نے 2020 میں مرتب کی، اس میں لکھا گیا:

"Muslim students in public schools often feel that their religious identity is treated as a problem to be managed, rather than a reality to be respected⁷".

"مسلم طلبہ کو اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی مذہبی شناخت کو ایک ایسے مسئلے کے طور پر دیکھا جاتا ہے جسے سنبھالنا ہے، نہ کہ ایک حقیقت کے طور پر جس کا احترام کیا جائے۔"

یہ جملہ اس پوری بحث کے مرکزی مفہوم کو واضح کرتا ہے کہ اسلامی شناخت کو فکری، تدریسی اور سماجی سطح پر نہ صرف تسلیم نہیں کیا جا رہا بلکہ اسے مسلسل دبا کر یا اجنبی بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ وہ ماحول ہے جو طالب علم کے شعور، نظریاتی وفاداری اور تعلیمی محرک کو خاموش مگر شدید زوال کی طرف لے جاتا ہے۔

جامعات میں علمی اسلاموفوبیا

اسلاموفوبیا کی جو شکل سیاسی تقاریر یا قانون سازی میں نظر آتی ہے، وہ اپنی سب سے گہری، پائیدار اور خطرناک صورت میں جامعات کے علمی ڈھانچے میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں علمی زبان، تحقیق، اور تدریس کی آڑ میں تعصب اس قدر مہذب اور "علمی" روپ دھار لیتا ہے کہ اس کی موجودگی کا انکار کرنا اکثر علمی بددیانتی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ علمی اسلاموفوبیا نہ تو نعرہ بازی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، نہ کھلے تعصب کی شکل میں، بلکہ یہ لائبریریوں، تحقیقاتی جرائد، نصابی خاکوں، تھیسس سپروائزری تبصروں اور جامعاتی فنڈنگ کی ترجیحات میں نظر آتا ہے۔ مغربی جامعات میں اسلامی علوم کی تدریس ایک طویل استشراتی روایت کا تسلسل ہے۔ اگرچہ اب تدریسی زبان نسبتاً مہذب اور تعلیمی بن چکی ہے، لیکن بنیادی زاویہ نگاہ اب بھی "اسلام" کو ایک ابہام، خطرہ، یا تضاد کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اسلامی فلسفہ، فقہ، کلام اور تصوف جیسے دقیق علمی شعبے یا تو غیر متعلق سمجھے جاتے ہیں، یا انہیں "سیاست"، "انتہا پسندی" اور "تشدد" سے نکتی کیا جاتا ہے۔ اسلامی قانون پر کی جانے والی زیادہ تر تحقیقاتی کوششیں اس پہلو پر مرکوز ہوتی ہیں کہ شریعت جدید انسانی حقوق کے اصولوں سے کس حد تک متصادم ہے، جبکہ اس کی اخلاقی بنیاد، عدل کا فلسفہ، اور اجتماعی مصلحت کا نظریہ اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

یہ علمی تناظر صرف سلیبس یا تحقیقی موضوعات تک محدود نہیں، بلکہ جامعاتی رویوں میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ جب کسی مسلمان طالب علم یا محقق کی دلچسپی اسلامی فکر کے گہرے اور مثبت پہلوؤں میں ہوتی ہے تو اکثر اسے مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی تحقیق کو زیادہ "موجودہ دور سے ہم آہنگ" بنائے، یا "مغربی تنقیدی سانچوں" سے قریب کرے۔ اسلامی فکر کو بذاتِ خود ایک مستقل نظامِ علم کے طور پر قبول کرنے کے بجائے، اسے ایک "مطالعے کے موضوع" (object of study) کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ایسا موضوع جس پر بات تو کی جاسکتی ہے، لیکن جس سے متاثر ہونا، یا جسے حوالہ بنانا علمی غیر جانبداری کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

اس کے نتیجے میں ایک ایسا جامعاتی ماحول وجود میں آتا ہے جہاں مسلمان محقق کے لیے دور استے ہوتے ہیں: یا تو وہ اپنے دینی ورثے سے نظریاتی فاصلہ اختیار کرے، تاکہ اُسے "معروضی" اور "تحقیقی" کہا جائے، یا وہ اپنے

فکری شعور کے ساتھ تحقیق کرے، اور اس کے بدلے میں شک، تنقید، نظر اندازی یا ادارہ جاتی رکاوٹ کا سامنا کرے۔ یہ وہ "علمی اسلاموفوبیا" ہے جو تحقیق کو آزاد نہ چھوڑ کر مخصوص فکری خانوں میں قید کر دیتا ہے۔

اس تعصب کی ایک واضح شکل تحقیقی گرانٹس اور اسکالرشپ کی تقسیم میں نظر آتی ہے۔ اکثر اسلامی موضوعات پر تحقیق کے لیے وہی اسکالرشپ دی جاتی ہیں جو ان موضوعات کو "تشدد"، "بنیاد پرستی"، یا "ساماجی خطرے" کے سیاق میں پیش کریں۔ اگر کوئی محقق اسلامی قانون کو ایک اخلاقی نظام کے طور پر پیش کرتا ہے، یا خلافت اور امت جیسے تصورات کو مثبت انداز میں سمجھنا چاہتا ہے، تو اس کی تحقیق کو "غیر عصری"، "غیر سائنسی"، یا "آئیڈیالوجیکل" کہہ کر مسترد کر دیا جاتا ہے۔ یوں علمی پیمانے خود مذہبی وابستگی سے متاثر ہو جاتے ہیں، جو جدید علمی ماحول کی بنیادوں کے خلاف ہے۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایسے مسلمان اساتذہ، جو اسلامی تاریخ یا شریعت کے مثبت پہلو پر کام کر رہے ہوں، ان کے تحقیقی منصوبوں کو کم ترجیح دی جاتی ہے، یا ان کے تحقیقی مضامین عالمی جرائد میں قبول نہیں کیے جاتے۔ اس کے برعکس، اگر کوئی محقق اسلام کو ناکامی، تضاد یا عدم انطباق کے نظریے سے دیکھے تو اس کی تحقیق نہ صرف پذیرائی پاتی ہے بلکہ ادارہ جاتی سطح پر اسے پذیرائی بھی ملتی ہے۔ یہی وہ معیار ہے جو علمی اسلاموفوبیا کو ظاہری آزاد خیالی کے اندر ایک نظریاتی تعصب کے ساتھ زندہ رکھتا ہے۔ ایسا محقق جو اسلامی تہذیب کو مغربی اقدار کے برابر یا اس سے بہتر علمی، فکری یا اخلاقی بنیاد پر پیش کرنا چاہے، اسے اکثر "سیاسی"، "متعصب"، یا "غیر معروضی" سمجھا جاتا ہے۔ یوں آزادی تحقیق کا دعویٰ، عملی سطح پر نظریاتی یک رنگی میں بدل جاتا ہے۔ اس ماحول میں مسلمانوں کے لیے سچ لکھنا، حق لکھنا، یا اپنے علمی ورثے سے انصاف کرنا ایک قربانی، ایک مزاحمت، اور ایک شعوری فیصلہ بن جاتا ہے۔ پاکستانی محقق ڈاکٹر غلام یسین لکھتے ہیں:

"مسلم محقق جب اپنی تہذیب کو فکری افق پر زندہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو مغربی علمی ادارے اسے متحرک خطرہ کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اور یہ دیکھنا ہی اصل علمی اسلاموفوبیا ہے۔"⁸

لہذا معلوم ہوتا ہے کہ جامعاتی سطح پر اسلاموفوبیا محض کسی مذہب سے خوف یا نفرت کا نام نہیں، بلکہ یہ فکری غلبے کی وہ شکل ہے جو "علم" کے نام پر اپنے سوا کسی دوسری علمی روایت کو قبول نہیں کرتی۔ اور جب علم خود تعصب کا آلہ بن جائے، تو تعلیم رہتی ہے، مگر حکمت مفقود ہو جاتی ہے۔ مغربی جامعات میں اسلامی مطالعہ (Islamic Studies) کے مضامین اکثر ایسے فریم میں پیش کیے جاتے ہیں جو یا تو "سیاسی اسلام"، "اسلامی دہشت گردی"، یا "انتہا پسندی" جیسے بیانیوں سے جڑے ہوتے ہیں۔ اسلامی فلسفہ، کلام، تصوف، اور فقہ جیسے علوم کو یا تو

نظر انداز کیا جاتا ہے، یا ان پر استشراقی نکتہ نگاہ سے تنقید کی جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں مسلمان اسکالرز کے لیے یہ ماحول ایسا بن جاتا ہے جس میں وہ نہ آزادانہ تحقیق کر سکتے ہیں، نہ اپنے علمی زاویہ نگاہ کو بغیر شک و شبہ کے پیش کر سکتے ہیں۔

اسی تناظر میں ایک معروف واقعہ امریکہ کی prestigious جامعہ Duke University میں پیش آیا، جب عبدالمجید علی نامی ایک مسلم ریسرچ اسکالرنے 2019 میں اپنی ڈاکٹریٹ تھیسس کے لیے "اسلامی قانونی فلسفہ اور مغربی ہیومن رائٹس کی فکری تطبیق" کے عنوان سے مقالہ جمع کرایا۔ مقالہ نہایت اعلیٰ معیار پر مبنی تھا، اور اس میں امام شاطبی، ابن عاشور، اور المعلیٰ الیمینی جیسے کلاسیکی مفکرین کی فکر کو معاصر انسانی حقوق کے مباحث سے مربوط کیا گیا تھا۔ لیکن یونیورسٹی کی کمیٹی نے اس مقالے کو ابتدائی طور پر "سیاسی اور خطرناک" قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا۔ کمیٹی کے ایک رکن نے یہ تبصرہ دیا:

"The thesis appears to advocate for a religious legal framework that may be incompatible with liberal secular norms⁹."

"یہ مقالہ ایک ایسے مذہبی قانونی فریم ورک کی وکالت کرتا ہے جو شاید لبرل سیکولر اقدار سے ہم آہنگ نہیں۔" مقالہ بعد ازاں اپیل کے بعد منظور ہوا، لیکن اس تاخیر، نگرانی، اور تبصرے نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ مغربی جامعات میں اسلامی علمی فکر کو صرف علمی معیار پر نہیں بلکہ تہذیبی قبولیت کے پیمانوں پر جانچا جاتا ہے۔ لہذا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان محققین کو نہ صرف علمی معیار بلکہ نظریاتی ہم آہنگی کے پیمانے پر بھی کسوٹی پر رکھنا پڑتا ہے، جو تحقیقی آزادی کی نفی ہے۔

"کہا تھا: epistemic suppression کو phenomenon نے اسی Edward Said

"The Muslim voice is often allowed in Western academia, but only when it confirms or submits to the dominant paradigms of knowledge¹⁰."

"مسلمانوں کی آواز کو اکثر مغربی علمی دنیا میں اس وقت جگہ دی جاتی ہے جب وہ غالب علمی سانچوں کی تصدیق کرے یا ان کے تابع ہو۔"

مذکورہ گفتگو سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ علمی اسلاموفوبیا کی سب سے بڑی خطرہ شکل وہ ہے جو تحقیق کے دروازے کھلے رکھ کر درحقیقت ان دروازوں کے اندر نکتہ چینی، تحقیر، اور تعصب کے دباؤ کو داخل کرتی ہے۔ ڈاکٹر سلمان بلال اپنی تحقیق مغربی جامعات میں اسلامی مطالعات: علم یا حکمتِ استشراق؟ میں لکھتے ہیں:

"مغربی علمی اداروں میں اسلامی تحقیق اس وقت تک معتبر سمجھی جاتی ہے جب تک وہ مغرب کے تہذیبی بیانیے کو چیلنج نہ کرے۔ یہ علمی آزادی نہیں بلکہ فکری کنٹرول کی علامت ہے۔"¹¹

یہ جملہ اس فکری استبداد کی نشاندہی کرتا ہے جو بظاہر تعلیمی اداروں کی علمی وسعت میں پوشیدہ ہے، مگر دراصل مسلمان محقق کو نظریاتی طور پر ایک ایسی فریم میں قید کرتا ہے جس سے باہر نکلنے کی ہر کوشش کو یا تو "انتہا پسندی" یا "سماجی خطرہ" قرار دے دیا جاتا ہے۔

مسلم طلبہ کی خودی، سماجی اجنبیت اور علمی پسپائی

اسلاموفوبیا جب کلاس روم سے نکل کر ادارہ جاتی رویے، نصاب، اساتذہ کے طرزِ عمل اور طلبہ کے باہمی تعلقات میں داخل ہو جاتا ہے، تو اس کا سب سے شدید اثر نوجوان مسلمان طلبہ کی خودی، عزت نفس، اور شعوری توازن پر پڑتا ہے۔ یہ وہ پہلو ہے جو سب سے کم زیر بحث آتا ہے، مگر درحقیقت یہی وہ داخلی میدان ہے جہاں اسلاموفوبیا اپنی سب سے خطرناک شکل اختیار کرتا ہے۔ یہاں مذہب پر کوئی براہِ راست حملہ نہیں ہوتا، نہ شعائر پر پابندی عائد کی جاتی ہے، مگر طلبہ کے اندر یہ احساس جڑ پکڑ لیتا ہے کہ "میری مذہبی شناخت میرے لیے بوجھ ہے، اور اگر میں نے اس شناخت کو ظاہر رکھا تو مجھے نہ صرف کمتر سمجھا جائے گا بلکہ تنقید، اجنبیت، اور شکوک کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔" یہی احساس جب مستقل صورت اختیار کرتا ہے، تو نوجوان مسلم طلبہ دو شدید انتہاؤں کے درمیان جھولنے لگتے ہیں: یا تو وہ اپنی شناخت کو مکمل طور پر "چھپا لیتے ہیں" — حجاب ترک کر دینا، اسلامی نام کو مختصر کر دینا، نماز نہ پڑھنا، یا عربی زبان سے اجتناب؛ یا دوسری انتہا یہ ہوتی ہے کہ وہ "رد عمل کی شناخت" میں داخل ہو جاتے ہیں، یعنی وہ سماج سے کٹ کر ایسی فکری بندگی میں داخل ہوتے ہیں جہاں وہ مغربی معاشرے کو مکمل طور پر رد کر دیتے ہیں، خواہ وہ رد عمل علمی ہو یا جزوی طور پر سیاسی۔

ان دونوں انتہاؤں کا مشترکہ نتیجہ "تعلیمی پسپائی" اور "سماجی اجنبیت" کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایک طرف طالب علم کو اپنی کلاس میں مکمل اظہارِ رائے کی آزادی میسر نہیں رہتی، دوسری طرف وہ ساتھی طلبہ سے نظریاتی یا جذباتی ہم آہنگی کھو بیٹھتا ہے۔ نتیجتاً وہ کلاس روم میں جسمانی طور پر تو موجود ہوتا ہے، مگر فکری اور جذباتی طور پر غیر فعال۔ اس غیر فعالیت کے نتیجے میں اس کی تعلیمی کارکردگی متاثر ہوتی ہے، وہ گروپ ورک سے کتراتا ہے، اسائنمنٹس میں فکری پختگی دکھانے سے گریز کرتا ہے، اور یوں تدریجی طور پر حاشیے پر چلا جاتا ہے۔

Runnymede Trust (UK) کی 2020 کی ایک تحقیق کے مطابق:

"Muslim students who consistently experience exclusionary microaggressions report lower academic performance and higher dropout intentions compared to their non-Muslim peers".

"مسلم طلبہ جو بار بار امتیازی رویوں کا سامنا کرتے ہیں، اُن کی تعلیمی کارکردگی کم ہوتی ہے اور ان میں تعلیمی عمل سے باہر ہونے کا رجحان زیادہ ہوتا ہے۔"

یہ وہ حقیقت ہے جسے عمومی تجزیات نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اسلاموفوبیا صرف مذہبی مسئلہ نہیں بلکہ تعلیمی زوال اور ذہنی اضطراب کا سنگین سبب بن چکا ہے۔ مسلم طالبعلم کے لیے تعلیم اب محض کتابوں، لیکچرز اور امتحانات کا نام نہیں، بلکہ ایک سماجی و فکری جدوجہد کا میدان ہے، جس میں اسے نہ صرف اپنا علم ثابت کرنا ہوتا ہے، بلکہ اپنی پہچان، عقیدہ، اور عزت نفس کو بھی روزانہ کی بنیاد پر بچانا ہوتا ہے۔

اس مسلسل دفاعی حالت کا اثر طالبعلم کی شخصیت پر ایک اندرونی خوف، تذبذب اور غیر ضروری محتاط رویے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ سوال کرنے سے پہلے سوچتا ہے کہ کہیں میرا سوال "مذہبی" نہ لگے۔ وہ موضوعات چنتے وقت یہ سوچتا ہے کہ کہیں اس کا تحقیقی مضمون اسلامی اصطلاحات کی کثرت کے سبب مسترد نہ کر دیا جائے۔ وہ تعلیمی گفتگو میں بھی اپنی اصل شناخت کے اظہار سے کتر اتا ہے، اور یوں ایک ایسی حالت میں داخل ہو جاتا ہے جسے ماہرین نفسیات "self-censoring identity" کہتے ہیں — یعنی ایسی شناخت جو خود اپنے آپ سے خوفزدہ ہو۔

معروف مفکرہ ڈاکٹر فرزانہ بشیر اپنی تحقیق مسلمان طالبعلم اور مغربی جامعات کا تہذیبی تناؤ میں لکھتی ہیں:

"مغربی تعلیمی اداروں میں مسلم طلبہ کی خودی کا زوال اس وقت شدت اختیار کرتا ہے جب وہ تعلیمی عمل میں اپنی فکری اور روحانی وابستگی کو چھپانے لگتے ہیں۔ وہ تعلیم کے نظام میں جسمانی طور پر شامل ہوتے ہیں لیکن فکری سطح پر اجنبی اور منتشر رہتے ہیں۔"¹²

یہ جملہ اس پوری بحث کا نچوڑ ہے۔ مغرب میں مسلم طلبہ کا تعلیمی زوال صرف کم گریڈز یا کم اسکالرشپ تک محدود نہیں بلکہ ان کی داخلی خودی، شعوری آزادی اور فکری توانائی کی خاموش تحلیل ہے۔

لہذا معلوم ہوتا ہے کہ جب اسلاموفوبیا علمی اور تدریسی سانچوں سے نکل کر شناخت کے احساس تک پہنچ جائے، تو اس کا سب سے پہلا اور گہرا نشانہ طالبعلم کی "انا"، اس کی خودی اور اس کا تہذیبی شعور ہوتا ہے۔ اور جب نوجوان نسل کے اندر خودی کو شکست دے دی جائے، تو کوئی بیرونی پابندی یا قانون لگانے کی ضرورت نہیں رہتی — وہ خود بخود مغلوب ہو جاتی ہے۔

اسلامی تقویم، مذہبی تقریبات اور ادارہ جاتی پالیسی

مغربی تعلیمی اداروں میں اسلاموفوبیا کا ایک غیر محسوس مگر نہایت مؤثر مظہر اسلامی تہذیبی تقویم، مذہبی تقریبات، اور سالانہ عبادات کے حوالے سے ادارہ جاتی بے اعتنائی اور امتیاز کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ وہ پہلو ہے جو کسی ضابطہ اخلاق میں درج نہیں ہوتا، لیکن عملی سطح پر طالبعلم کی روزمرہ تعلیمی زندگی میں گہرا اثر رکھتا ہے۔ جب کسی تعلیمی ادارے کی تعطیلات، تہواروں، یا مذہبی توارخ کا نظام مکمل طور پر مغربی یا مسیحی کیلنڈر پر مرکوز ہو، اور دیگر مذاہب کی تقریبات کو علامتی سطح پر یا محض "ثقافتی نمائش" کے درجے تک محدود کر دیا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ادارہ "مذہبی برابری" کے اصول سے ہٹ کر "اکثریتی ثقافتی بالادستی" کو فروغ دے رہا ہے۔ مسلم طلبہ کے لیے رمضان، عیدین، یا جمعہ کی نماز جیسے دینی معمولات محض مذہبی ذمہ داری نہیں بلکہ ان کی تہذیبی خودی کا جزو لاینفک ہیں۔ لیکن جب انہی ایام میں امتحانات رکھ دیے جائیں، جب نماز کے اوقات کو کسی پالیسی یا سہولت میں شامل نہ کیا جائے، یا افطار و سحر کے نظام کو مکمل نظر انداز کر دیا جائے، تو طلبہ نہ صرف جسمانی دقت کا سامنا کرتے ہیں بلکہ وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ان کی روحانی وابستگی ادارہ جاتی سطح پر بے وقعت ہے۔

کینیڈا کے شہر ٹورنٹو کی York University میں 2022 میں ایک واقعہ منظر عام پر آیا، جب ایک مسلم طالبعلم نے رمضان کے دوران شام سات بجے طے شدہ امتحان کے وقت کو تبدیل کرنے کی درخواست دی، تاکہ وہ افطار کے ساتھ عبادت بھی ادا کر سکے۔ یونیورسٹی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "امتحانی نظام عمومی اکثریتی سہولت کے مطابق ترتیب دیا جاتا ہے۔" اس فیصلے پر شدید احتجاج ہوا، لیکن انتظامیہ نے موقف قائم رکھا۔ یہ واقعہ اس رجحان کو واضح کرتا ہے کہ کس طرح "اکثریتی سہولت" کے نام پر اقلیتی عبادات کو غیر اہم تصور کر لیا جاتا ہے۔ اسی قسم کی صورتحال برطانیہ، جرمنی اور آسٹریلیا میں متعدد مواقع پر ریکارڈ ہو چکی ہے، جہاں یونیورسٹیوں نے عید کے دن حاضری لازمی رکھی، یا رمضان میں روزے دار طلبہ کو کھیلوں یا پریکٹیکل امتحانات میں استثنائے سے انکار کر دیا۔ ان واقعات میں اسلام پر براہ راست تنقید نہیں کی گئی، لیکن طالبعلم یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو گیا کہ اس کا دینی معمول ایک "رکاوٹ" ہے، جس کے لیے کسی ادارہ جاتی لچک یا احترام کی گنجائش نہیں۔

یہ امتیاز صرف تقریبات یا تعطیلات تک محدود نہیں۔ اکثر یونیورسٹیوں میں مسلمان طلبہ تنظیموں کو اپنی مذہبی تقریبات کے لیے کمرے مختص کروانے میں دقت ہوتی ہے۔ انہیں متعدد سطحوں پر اجازت، نگرانی، اور مشروط منظوری کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جبکہ دیگر مذاہب کی تقریبات کو بہ آسانی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ اس عمل

سے طالب علم کو ایک داخلی پیغام ملتا ہے: "تمہارا دین یا تو غیر اہم ہے یا مشکوک۔"

اسی طرح، کئی ادارے بین المذاہب مکالمے (interfaith dialogues) کا اہتمام کرتے ہیں، لیکن ان میں اسلام کو اکثر بطور "معاشرتی مسئلہ" یا "مباحثے کی علامت" کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مسلمان مقررین کو زیادہ تر "وضاحت دینے" کے لیے بلایا جاتا ہے، نہ کہ اپنی فکری روایت پیش کرنے کے لیے۔ اس عمل سے مسلم طلبہ میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ ان کی مذہبی وابستگی کو صرف تب قبول کیا جاتا ہے جب وہ اپنی پوزیشن کا دفاع کریں، نہ کہ فخر سے پیش کریں۔ ڈاکٹر نائلہ یاسمین اپنے مقالے یورپ میں اسلامی تہواروں کا ادارہ جاتی ادراک میں لکھتی ہیں:

"مغربی تعلیمی ادارے اسلامی تقویم کو ادارہ جاتی اہمیت دینے کے بجائے صرف 'ثقافتی علامات' کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ اس رویے سے طلبہ کو یہ پیغام ملتا ہے کہ ان کا مذہب رسمی اظہار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔"¹³

لہذا معلوم ہوتا ہے تعلیمی اداروں کی وہ پالیسیاں جو بظاہر "غیر جانب دار" اور "مشترکہ نظم" پر مبنی ہوتی ہیں، درحقیقت ثقافتی تعصب اور شناختی اجنبیت کو فروغ دینے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ جب کسی تہذیب کی علامات، عبادات اور نظام وقت کو تعلیم کے اداروں میں مکمل طور پر پس منظر میں ڈال دیا جائے، تو وہاں علمی ترقی نہیں بلکہ تہذیبی غیر مرئیت (invisibility) پختی ہے، اور یہی علمی اسلاموفوبیا کی باریک ترین اور سب سے طاقتور شکل ہے۔

مسلم طالبات، حجاب اور دوہرا تعصب

اسلاموفوبیا کے تعلیمی مظاہر کی سب سے پیچیدہ اور کثیر الجہتی شکل مسلمان طالبات کے تجربات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ مغربی تعلیمی اداروں میں مذہبی لباس، خصوصاً حجاب، کو صرف ثقافتی یا روحانی علامت کے بجائے "جنس" اور "طاقت" کے تناظر میں سمجھا جاتا ہے۔ یہ وہ زاویہ ہے جو مغربی فیمنسٹ ڈسکورس، سیکولر شناخت، اور قومی سلامتی کے خدشات کے ساتھ مل کر ایک دوہری فکری دیوار قائم کرتا ہے، جس کے دونوں طرف سے مسلمان طالبہ کو تنقید، نگرانی اور خاموش جبر کا سامنا ہوتا ہے۔

حجاب پہننے والی طالبات پر اکثر ایک خود ساختہ مفروضہ تھوپ دیا جاتا ہے کہ وہ یا تو مجبور ہیں، یا پس ماندہ سوچ کی نمائندہ؛ یا یہ کہ وہ "جدید اقدار" سے ہم آہنگ نہیں اور ان کی موجودگی "خواتین کی آزادی" کے تصور کے خلاف ہے۔ جب یہ مفروضہ استاد، کلاس فیلوز یا حتیٰ کہ پالیسی سازوں کے لاشعور کا حصہ بن جائے تو مسلم طالبہ کو اپنی مذہبی وابستگی کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کے لیے دوہری جدوجہد کرنی پڑتی ہے: ایک علمی اور دوسری وجودی۔

فرانس جیسے ممالک میں، جہاں حجاب پر ریاستی سطح پر پابندیاں نافذ کی گئیں، وہاں صرف اسکولوں میں ہی نہیں بلکہ جامعات میں بھی حجاب کو "ریاستی سیکولر ازم کے خلاف" ایک چیلنج کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ 2021 میں Sorbonne University کی ایک طالبہ مریم پوشرا کو یونیورسٹی کے ایک لیکچر سے اس لیے باہر نکال دیا گیا کہ وہ فل سیلو برقعہ اور اسکارف میں تھی، حالانکہ فرانسیسی قانون میں یونیورسٹی سطح پر حجاب پر قانونی پابندی نہیں۔ یہ عمل یونیورسٹی کے "عوامی ماحول" اور "روشن خیالی" کے تحفظ کے نام پر کیا گیا۔ یہ صرف ایک واقعہ نہیں، بلکہ ایک ایسا رویہ ہے جو مغربی اداروں میں عام ہوتا جا رہا ہے۔ کہ طالبہ کی قابلیت، دلچسپی یا علمی شغف کو اس کے لباس یا مذہبی علامت پر فوقیت نہیں دی جاتی، بلکہ اس کے وجود کو ہی شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی مظہر پر مغربی ماہر تعلیم Dr. Sahar Aziz لکھتی ہیں:

"Muslim women are uniquely positioned at the intersection of race, religion, and gender—making them disproportionately vulnerable to educational discrimination in secular institutions¹⁴".

"مسلمان عورتیں نسل، مذہب اور جنس کے سنگم پر کھڑی ہوتی ہیں، جو انہیں سیکولر اداروں میں تعلیمی امتیاز کا غیر متناسب ہدف بنا دیتا ہے۔"

لہذا معلوم ہوتا ہے کہ مسلم طالبہ کو مغرب میں ایک نہیں، بلکہ تین شناختی پرتوں سے نپٹنا ہوتا ہے: مذہب، جنس، اور ثقافت۔ وہ صرف ایک طالبہ نہیں، بلکہ ایک "استعارہ" بن جاتی ہے — جسے یا تو آزاد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، یا زیر نگرانی رکھنے کی۔ ڈاکٹر سدرہ امتیاز اپنی تحقیق نقاب کے پیچھے: تعلیمی اداروں میں مسلم طالبات کا بیانیہ میں اس صورتحال کو یوں بیان کرتی ہیں:

"جب حجاب کو ذاتی عبادت کے بجائے سیاسی علامت بنا دیا جائے، تو مسلم طالبہ کو تعلیم کے میدان میں داخل ہونے سے پہلے اپنی نیت، آزاد مرضی اور فکری استعداد کا دفاع کرنا پڑتا ہے۔"¹⁵

یہ قول اس کشمکش کی گہرائی کو عیاں کرتا ہے جو ایک مسلمان طالبہ کو ہر دن، ہر کلاس، اور ہر بحث میں برداشت کرنا پڑتی ہے۔ وہ صرف سیکھنے نہیں آئی، بلکہ اپنی موجودگی کو "قابل قبول" ثابت کرنے بھی آئی ہے۔ اسے صرف نصاب ہی نہیں، بلکہ نظریاتی تنقید، صنفی مفروضات، اور تہذیبی فاصلے کو بھی عبور کرنا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک ایسا باطن تیار کرتا ہے جس میں مسلم طالبہ خود کو نہ مکمل طور پر اسلامی ظاہر کر سکتی ہے، نہ مکمل مغربی۔

نتیجہ: شناخت کا اضطراب، سماجی علیحدگی، تعلیمی دباؤ، اور ذہنی انتشار — اور یہی وہ مقصد ہے جس کے ذریعے اسلاموفوبیا اپنی مہذب ترین صورت میں سب سے زیادہ زہرناک اثر پیدا کرتا ہے۔

نتائج تحقیق:

مغربی تعلیمی اداروں میں اسلاموفوبیا کی موجودگی ایک سنگین اور پیچیدہ مسئلہ ہے جس کے گہرے اثرات مسلم طلبہ، خصوصاً مسلم خواتین، کی خودی، تعلیمی کارکردگی اور سماجی حیثیت پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس تحقیق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب تعلیمی ادارے ثقافتی تعصبات، مذہبی مفروضات اور یک طرفہ تاریخ نویسی کو فروغ دیتے ہیں، تو یہ نہ صرف تعلیمی معیار کو متاثر کرتے ہیں بلکہ ایک پورے طبقے کو شناختی بحران میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ مغربی نصاب میں اسلام کی جو تصویر پیش کی جاتی ہے، وہ عموماً قدامت پسند، انتہا پسند اور جمود کا شکار ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں طلبہ میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمیاں اور تعصبات پروان چڑھتے ہیں۔

اس تحقیق سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیمی عملے کا رویہ، ادارہ جاتی پالیسیاں اور نصاب میں موجود تعصبات مسلمانوں کو سماجی اجنبیت، تعلیمی پسپائی اور سیاسی و ثقافتی چیلنجز کا سامنا کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ خاص طور پر مسلم طالبات، جو حجاب یا دیگر مذہبی علامتوں کے ساتھ تعلیمی اداروں میں آتی ہیں، انہیں دوہرا تعصب اور مختلف قسم کی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے، جو ان کی تعلیمی اور سماجی ترقی کو محدود کرتے ہیں۔

اس کے باوجود، یہ کہنا ضروری ہے کہ مغربی تعلیمی اداروں میں اسلاموفوبیا کے خلاف اقدامات کی ضرورت ہے۔ نصاب میں توازن کی ضرورت ہے تاکہ اسلامی تہذیب کے علمی، ثقافتی اور فلسفیانہ پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا جاسکے۔ تعلیمی اداروں کو اپنے عملے کو حساس بنانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ مسلم طلبہ کی مذہبی اور ثقافتی شناخت کو عزت دیں اور ان کے خلاف کسی بھی قسم کے امتیاز یا تعصب سے بچیں۔

مستقبل میں اس مسئلے پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے تاکہ ہم مغربی تعلیمی اداروں میں اسلاموفوبیا کے خلاف مؤثر حکمت عملی وضع کر سکیں، اور یہ یقینی بنایا جاسکے کہ تمام طلبہ کو ایک منصفانہ اور غیر تعصبی تعلیمی ماحول فراہم کیا جائے۔

حوالہ جات

- ¹ Ali A. Mazrui, Islam Between Globalization and Counterterrorism, Trenton: Africa World Press, 2006, p. 42
- ² EHRC, Religion or Belief: Is the Law Working?, London: EHRC Publications, 2016, p. 61
- ³ عدنان رشید، اسلامی تعلیم اور مغربی نصاب، کراچی: فکری ادب پبلشرز، 2019، ص 83
- ⁴ Nasar Meer & Tariq Modood, Islamophobia and Education in the UK, London: UCL Press, 2019, p. 59
- ⁵ OISE, Islamophobia in Ontario Classrooms, Toronto: University of Toronto, 2020, p. 37
- ⁶ عفت نعیم، اسلامی شناخت اور جدید تعلیم، اسلام آباد: ادارہ علوم انسانی، 2017، ص 133
- ⁷ Observatoire de la Laïcité, Laïcité et Éducation, Paris: Gouvernement Français, 2020, p. 22
- ⁸ غلام یسین، جدید تعلیم اور اسلامی خودی، لاہور: مکتبہ خضر، 2018، ص 106
- ⁹ Duke University Graduate Committee Internal Memo, 2019
- ¹⁰ Edward W. Said, Orientalism, New York: Vintage Books, 1978, p. 308
- ¹¹ سلمان بلال، مغربی جامعات میں اسلامی مطالعات، لاہور: ادارہ مطالعات اسلامی، 2020، ص 112
- ¹² فرزانه بشیر، مسلمان طالبعلم اور مغربی جامعات کا تہذیبی تناؤ، لاہور: بینات اکیڈمی، 2021، ص 161
- ¹³ نانکدیا سمین، یورپ میں اسلامی تہواروں کا ادارہ جاتی ادراک، اسلام آباد: انسٹیٹیوٹ آف پولیٹیکل اسٹڈیز، 2021، ص 88
- ¹⁴ Sahar F. Aziz, The Muslim Veil Post-9/11: Rethinking Women's Rights and Religious Freedom, Harvard Journal of Law & Gender, Vol. 32, 2009, p. 398
- ¹⁵ سدرہ امتیاز، نقاب کے پیچھے، کراچی: خواتین مطالعہ مرکز، 2020، ص 127